میرزاادیب (آخری قسط)

آغا شورش کاشمیریؒ

تاش پورے زوروں پر تھی کہ یزدانی کوان گرم گرم نرم نرم پوریوں کا خیال آیا جو ہم سید مٹھا بازار سے مشہور حلوائی نِلّو سے خرید کر لائے تھے۔اس نے نعرہ مارا۔

''پوریاں''.....سب کے ہاتھوں سے تاش کے پتے گر پڑے۔یزدانی کمرے کے اس گوشے میں گیا جہاں ایک کرسی کے نیچے پوریاں رومال میں پڑی تھیں۔رومال غائب تھا۔اب تاش کے پتوں کی طرح ہم خود بھی گر پڑے۔دس پندرہ منٹ بعد علاؤالدین اختر نے آ کر بتایا کہ راستے میں عبدالکریم ملا تھا۔کہتا تھا.....''میں بڑا استاد آدمی ہوں''

تو عبدالکریم الفت اپنی استادی دکھا گیا تھا۔ہمیں سخت غصّہ آیا اور تاش بھول کر اس شخص سے انتقام لینے کی تجویزوں پر غور کرنے لگے جس نے ہمیں نرم نرم پوریوں سے محروم کر دیا تھا۔خیر یہ بھی کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔معاملہ صرف یہ تھا کہ وہ ہمیں استادی دکھا گیا تھا اور یہ چیز ہمارے لئے قابلِ برداشت نہیں تھی۔یزدانی نرم طبیعت کا آدمی تھا۔اس نے اپنی طرف سے ایک نرم تجویز پیش کی۔

''عبدالکریم سے کہا جائے کہ وہ دو دن کے اندر اندر پوریوں سے بھری ہوئی ٹوکری ہمارے آگے رکھ دے''

''اور خود ادب سے ایک طرف کھڑا ہو جائے''

چونی لال کاوش بولا

''نہیں وہ بھی پوریاں کھانے میں ہمارے ساتھ شامل ہو جائے''۔میں نے یوں تجویز کی تائید کی۔سب کو یہ تجویز پسند آ گئی۔

''اور اگر وہ ٹوکری لے کر ہمارے حضور میں نہ آیا تو.....''یہ الفاظ شاید علاؤالدین اختر نے کہے تھے۔ہمارے سر ایک بار پھر غور و فکر کے لئے جھک گئے، کیونکہ عبدالکریم بھی ایک کایاں تھا۔دو تین منٹ گہرے غور و خوض کے بعد حکیم بدر محی الدین نے فیصلہ کر دیا۔

''اگر عبدالکریم نے ہماری شرط ماننے سے انکار کر دیا تو اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔''

''بالکل ٹھیک''

سب تائیداً بول اُٹھے اور علاؤالدین اختر کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ جلد سے جلد عبدالکریم کے گھر جائے اور اسے یہ چیلنج دے آئے۔فرض کچھ ناخوشگوار تھا' تاہم سب کے اصرار پر اختر کو یہ بات ماننی پڑی۔دوسرے دن جب ہم حکیم

صاحب کے گھر میں اکٹھے ہوئے تو ہماری نگاہیں علاؤالدین اختر کو ڈھونڈ رہی تھیں اور وہ موجود نہیں تھا۔تھوڑی دیر بعد وہ ہانپتا ہوا آ گیا۔

''وہ.....کہتا ہے.....میں ٹوکری.....لینے جا رہا ہوں.....میرے گھر.....آ جاؤ۔''

''وہ مارا'' سب نے نعرہ مارا۔ہم مکان سے نیچے اُتر کر لوہاری دروازے میں سے گزر کر انارکلی کا ابتدائی حصہ طے کر کے گنپت روڈ پر پہنچ گئے پھاٹک میں داخل ہوئے۔عبدالکریم چارپائی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔اس کی ہیئت دیکھ کر سب بے اختیار ہنس پڑے۔

''ارے کیا ہوا تجھے عبدل.....کریمے!'' حکیم صاحب بولے۔

عبدالکریم خاموش۔

''تجھ پر خدا کی مار کیا ہوا تجھے!'' چونی لال کاوش نے پوچھا۔

کوئی جواب نہیں۔

''بے چارہ مرتو نہیں گیا''۔اختر نے اپنی طرف سے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا۔

''مرے تُو.....میں کیوں مروں؟'' عبدالکریم بول پڑا

''شکر ہے زندہ ہے'' حکیم صاحب نے ہم سب کی ترجمانی کی۔

ہم چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''پوریوں کی ٹوکری کہاں ہے؟''

''پوریوں کی ٹوکری کیسی؟.....تم لوگوں نے مجھے چیلنج دیا تھا۔میں چیلنج کا جواب چیلنج سے دے سکتا ہوں۔''

عبدالکریم چارپائی سے اُٹھ کر کچھ دُور جا کر کھڑا ہوا اور ہاتھ لہرا لہرا کر تقریر کرنے لگا۔

''تم نے سمجھا تھا میں ڈر جاؤں گا۔میں ڈرنے والا نہیں ہوں۔ویسے کہو ایک ٹوکری نہیں بیس ٹوکریاں ابھی حاضر کر دیتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی۔''چلو چلیں اور آئندہ اِدھر کوئی شخص نہ آئے'' حکیم صاحب بولے

''حقّہ پانی بند'' کاوش نے بلند آواز میں کہا

''حُقّہ پانی کیا،روٹی اور کپڑا بھی بند'' عبدالکریم نے آگ پر تیل چھڑک دیا۔

ہم بھنا کر گلی سے باہر نکل آئے۔اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے عبدالکریم بازو پھیلائے سڑک پر کھڑا ہے۔

''یارو واپس چلو۔پوریاں انتظار کر رہی ہیں'' وہ ہنس کر کہہ رہا تھا۔واپس جانے کے لئے ہم تیار نہیں تھے۔اس

نے بار بار راستہ روکا تو لوٹ گئے۔ پھاٹک کے اندر چارپائی پر ایک ٹوکری پڑی تھی۔

''یہ کہاں سے آ گئی؟'' اختر نے پوچھا۔

''تم سب اندھے ہو..... چارپائی کے نیچے پڑی تھی.....

عبدالکریم الفت کی یہ عادت تھی، ایک دم شعلہ جوالہ بن جاتا تھا اور پھر نارمل بھی ہو جاتا تھا۔ وہ کب خفا ہو جائے گا۔ یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا اور کبھی صلح بھی کر لے گا۔ اس امر کا یقین بھی کوئی شخص نہیں دلا سکتا تھا۔

عبدالکریم سے میرا براہِ راست مقابلہ موری دروازے کے باہر لاہور میونسپل کے ریڈنگ روم میں ہوتا تھا۔ اس ریڈنگ روم میں اخبارات کے علاوہ اردو کے موقت الشیوع رسائل بھی پہنچتے تھے مگر یہ رسائل خاص طور پر ان کے خاص نمبر اور سالنامے بالعموم پبلک کو نہیں دیئے جاتے تھے۔ جو شخص لائبریرین سے خوشگوار تعلقات استوار کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ اسے نہ صرف یہ رسالے دیئے جاتے تھے بلکہ انہیں گھر لے جانے کی بھی اجازت دے دی جاتی تھی۔ یہاں صورت یہ تھی کہ لائبریرین صاحب میری شاعری کو بھی پسند کرتے تھے، اور میرے درخشاں مستقبل کی بھی کئی بار پیش گوئی کر چکے تھے اور ادھر عبدالکریم بھی انہیں متاثر کرنے میں ناکام نہیں رہا تھا۔ عبدالکریم شاعری تو ویسے ہی کرتا تھا مگر اس کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ مولانا ظفر علی خان کی بے شمار پوری کی پوری نظمیں اسے یاد تھیں اور جب یہ نظمیں سنانے پر تُل جاتا تھا تو کیا مجال ایک لمحے کے لئے بھی رُک جائے۔ صرف یہی نہیں اسے مولانا ابوالکلام آزاد کے لاتعداد فقرے یاد تھے۔ اس کا اپنا انداز بھی خطیبانہ تھا۔ اپنے لمبے لمبے ہاتھ فضا میں لہرا کر بولنا شروع کر دیتا تھا تو بس بولتا ہی چلا جاتا تھا۔ ریڈنگ روم میں کوئی نمبر آتا تھا تو ہم دونوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ پہلے پرچہ حاصل کر کے گھر لے جائیں۔ کبھی میں کامیاب ہو جاتا تھا اور کبھی عبدالکریم۔ ہم دونوں ن۔م راشد کے ماموں جان وحید کیانی کے ادبی رسالے ''قوسِ قزح'' کے سالنامے کا انتظار کر رہے تھے۔ خبر مل چکی تھی کہ یہ سالنامہ دو چار دن میں آنے والا ہے۔

''قوسِ قزح'' اپنے نام کی مناسبت سے بڑا خوبصورت پرچہ ہوتا تھا۔ اس کے عام نمبروں میں بھی اختر شیرانی کی نظمیں چھپتی رہتی تھیں اور ہم ان کی نظموں کی بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ سالنامہ چھپ گیا ہے۔ بازار میں آ گیا ہے اور میں دوسرے روز علی الصبح جب کہ لائبریری کھلی بھی نہیں تھی۔ لائبریری سے کچھ دور باغ میں بچھے ہوئے بنچ کے اوپر بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے میرا مقصد یہ تھا کہ جیسے ہی لائبریری کھلے میں لائبریرین کی خدمت میں حاضر ہو کر ''قوس قزح'' حاصل کروں۔ اگر تاخیر سے کام لیا تو عبدالکریم لے اُڑے گا اور مجھے خوب ترسائے گا۔ شیخ عبدالرحمٰن صاحب..... لائبریرین کا یہی نام تھا..... آ گئے۔ انہوں نے تالے میں چابی ڈالی اور میں نے جھٹ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بڑے ادب سے سلام کیا اور منتظرانہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

''تم رات کیوں نہیں آئے ؟لائبریرین کے یہ الفاظ سن کر میرا ماتھا ٹھنکا، کہیں یہ کم بخت عبدالکریم شام ہی کو تو نہیں آ گیا تھا اور لائبریرین نے میرے شبے کی تصدیق کر دی۔

''وہ تو رات کو آٹھ بجے تک یہاں رہا اور پرچہ لے کر گیا۔''

''مگر آپ نے وعدہ تو مجھ سے کیا تھا'' میں نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''وہ بڑی بلا ہے، جانتے نہیں؟''

لائبریری کا دروازہ کھل گیا' لوگ اندر داخل ہو کر اخبارات دیکھنے لگے اور میں باہر ہی کھڑا رہا۔ اتنے میں آواز آئی۔

''سلمٰی سے دل لگا کر بدنام ہو رہا ہوں''

مڑ کر دیکھا' عبدالکریم قریب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''میرزا یار! اختر کی بالکل نئی نظم قوسِ قزح میں چھپی ہے''.....بستیوں کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں۔ سلمٰی سے دل لگا کر بدنام ہو رہا ہوں''۔

عبدالکریم مجھے چڑا رہا تھا اور میں جل بھُن کر کباب ہو گیا تھا۔ اُس صبح بات بڑھ گئی.....تو تو میں میں تک نوبت پہنچ گئی۔ عبدالکریم ہنس ہنس کر قوسِ قزح کے سالنامے کے مندرجات کا ذکر کرتا جاتا تھا اور میں بار بار عبدالرحمٰن سے کہتا چلا جاتا تھا۔

''شیخ صاحب! اس کے منہ میں لگام دو''

مگر عبدالکریم کے منہ میں لگام دینا شیخ صاحب کے بس کا روگ نہیں تھا نتیجۃً یہ ہوا کہ میں نے عبدالکریم سے مخاطب ہو کر کہا ''بس اب میرا تیرا تعلق ہمیشہ کے لئے ختم''۔

''ختم تو ختم ہی سہی'' وہ بولا۔

میں اپنے گھر چلا گیا۔

وہ دن خاصی بیزاری میں کٹا۔ رات کو بھی یہی عالم تھا۔ صبح امی نے دہی لانے کے لئے کہا۔ میں نے برتن اٹھایا اور استاد فضل الٰہی فضل شیر فروش کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ گلی سے باہر نکلا ہی تھا کہ عبدالکریم کو دیکھا۔ صدردین موچی کے تھڑے کے سامنے کھڑا ہے اور ہاتھ میں ایک لفافہ بھی ہے۔

''میرزا یار! اب بھی خفا ہو.....دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں.....'' اور اس نے خالی کاغذ ہٹا کر قوسِ قزح کا چمکتا دمکتا ہوا سالنامہ مجھے دکھایا۔

''خدا کی قسم خرید کر لایا ہوں تیرے لئے' میں نے کہا میرا میرزا یار ناراض ہو گیا ہے''۔

میرے جذبات میں ایک طوفان سا برپا ہوگیا۔ میں اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتا تھا مگر مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ایک منٹ کے بعد ہم گلے مل گئے.....اور میرے گلے میں سے اٹک اٹک کر نکلا۔

''عبدالکریم! تم بڑے استاد آدمی ہو''۔

استادیاں ہی استادیاں.....اصل میں عبدالکریم گونا گوں استادیوں کا مالک تھا مگر میں نے اپنے لڑکپن کے دوست عبدالکریم الفت کا ایک اور رنگ بھی دیکھا ہے۔ مجھے خوب یاد پڑتا ہے کہ راوی روڈ پر جہاں آج کل مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کا مکان واقع ہے۔ وہاں ہمارا ایک دوست رہتا تھا جسے مشاعرہ بازی کا بڑا شوق تھا۔ اس نے ایک روز بزم مشاعرہ کے انعقاد کا اہتمام کیا اور ہم سب کو اپنے گھر پر بلا لیا۔ میں جب وہاں پہنچا تو سارے دوست وہاں پہنچ چکے تھے۔ ایک طرف ایک لمبا تڑنگا آدمی بھی بیٹھا تھا جسے میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مشاعرہ شروع ہوگیا۔ شعر پڑھے جانے لگے۔ میں نے دیکھا کہ عبدالکریم بڑی سنجیدگی سے داد دے رہا ہے۔ بیشتر خاموش ہی رہتا ہے۔ یہ تبدیلی میرے لیے حیران کُن تھی۔ باقی سب لوگ پڑھ چکے تو وہ لمبے تڑنگے صاحب اپنا فارسی کلام سنانے لگے۔ عبدالکریم نے ایک ایک شعر پر نہیں، ایک ایک مصرعے پر بے پناہ داد دی۔ کھانا کھانے کے بعد جب ہم اٹھنے لگے تو عبدالکریم تڑپ کر ایک طرف چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں جوتوں کی ایک جوڑی تھی جسے اس نے ایک طرف رکھ دیا۔ یہ جوتے انہیں صاحب نے پہن لیے جنہوں نے مشاعرے میں فارسی غزل سنائی تھی۔ انہوں نے عبدالکریم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور چلے گئے ان کے جانے کے بعد میں نے عبدالکریم سے پوچھا۔

''یار یہ کون تھا؟''

میرے استاد ''نیاز نعمانی'' میں نے ساتویں جماعت میں ان سے پڑھا ہے''۔

اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو عبدالکریم نے اپنے ساتویں جماعت کے استاد کا نام نیاز نعمانی ہی بتایا تھا مجھے نام کی صحت پر پورا پورا یقین نہیں ہے اور اس بات کا بھی یقین نہیں ہے کہ عبدالکریم نے ساتویں جماعت کہا تھا یا آٹھویں جماعت بہرحال اس روز اس نے اپنے ایک استاد کی اس طرح عزت کی تھی۔

ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ میں اور وہ انارکلی میں سے گزر رہے تھے۔ اچانک وہ رُک گیا اور اخبار کے ایک کاغذ کو سڑک پر سے اٹھایا۔ اسے پہلے جو چوما پھر آنکھوں سے لگایا۔ یہ روزنامہ ''زمیندار'' سنڈے ایڈیشن کا پہلا صفحہ تھا جس میں مولانا ظفر علی خان کی ایک نظم چھپی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس نے مولانا کے نام کو چوما تھا۔ اور پھر وہ منزل آ گئی کہ میرے اور میرے لڑکپن کے دوست عبدالکریم الفت کے راستے جُدا ہوگئے! میں اپنے راستے پر آہستہ آہستہ چلنے لگا لیکن وہ سیاست کے خارزاروں میں سے ہوکر عظمت وشہرت کے نئے نئے افقوں کی طرف پرواز کرنے لگا۔

وہ عبدالکریم الفت سے آغا شورش کاشمیری بن گیا۔

آغا شورش کاشمیری برصغیر کا مسلمہ لیڈر......نامور صحافی......شعلہ بیان مقررّ۔

میری اس سے ملاقات شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ہم سب دوست حکیم بدرالدین، چونی لال کاوش، یزدانی جالندھری، علاؤالدین اختر زندگی کے طوفانی حوادث میں تنکوں کی طرح بکھر گئے۔آغا شورش کاشمیری بلند سے بلند تر ہوتا گیا......آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔اور پھر ایک روز میں اس کے ہاں گیا۔وہ بیمار تھا، پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی دو بچیاں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ایک کی گود میں ٹائپ کیا ہوا ایک ضخیم مسودہ تھا۔بچیاں مجھے دیکھ کر ادب سے کھڑی ہوگئیں اور سلام کر کے کمرے سے نکل گئیں۔عبدالکریم نے ہاتھ بڑھا کر وہ مسودہ اپنے سینے پر رکھ لیا۔

''یہ کیا ہے آغا صاحب''

اس نے شکایت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا

''میرزا! میں تیرا وہی عبدالکریم ہوں''

''مگر اب آپ......''

''اللہ نے عزت دی ہے......تیرے دوست کو اللہ نے عزت دی ہے......اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے''۔وہ ذرا رُکا اور پھر کہنے لگا۔یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات ہے' نظر ثانی کر رہا ہوں۔اس کام میں میری یہ لڑکیاں میری مدد کر رہی ہیں۔''

میرے ذہن میں اس کے یہ الفاظ پھڑ پھڑا رہے تھے۔

''میرزا! میں تیرا وہی عبدالکریم الفت ہوں''۔

میں نے کہا

''عبدالکریم! چلو گے نہیں؟''

''کہاں''

''کلچے لینے کے لئے......نانا جان کی دکان پر......استادی تو نہیں دکھاؤ گے؟

اس نے میرے الفاظ سنے......مسودے سے ہاتھ کھینچ لیا۔میں نے دیکھا کہ وہ اوپر دیکھ رہا ہے۔اور یکا یک مجھے محسوس ہوا کہ اس کی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہوگئی ہیں۔آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

''میرزا!'' اس نے زیر لب کچھ کہا۔میں سمجھ نہ سکا وہ اوپر دیکھتا رہا۔......اور میری نظریں فضا میں بھٹکتی رہیں اور اس کے چند روز بعد میرا لڑکپن کا دوست عبدالکریم الفت اور ملت اسلامیہ کا قابلِ فخر فرزند دنیا سے رخصت ہوگیا۔

(ختم شد)